غزل یعقوب
ٹیچنگ ریسرچ ایسوسی ایٹ، شعبہ اردو
بین الاقوامی اسلامی یونی ورسٹی، اسلام آباد

اختر النسا بیگم اور ٹیڑھی لکیر میں نسائی کرداروں کا تقابلی مطالعہ

This is a comparative study of two novels Tehrhee Lakeer and Akhtar U Nisa Begum. I tried to explore differences and commonalities of women's status in social context of colonial India. The study also deals with the position and role of women through the Female characters of these above mentioned novels. My research categorically deals with the issue of women empowerment in colonial society through the lens of Nazar Sajjad Haider and Esmat Chughtai.

اختر النسا بیگم اور ٹیڑھی لکیر دونوں ناول ہندوستانی معاشرے کی تصویر کشی کرتے ہیں۔ دونوں مصنفین نے معاشرتی مسائل کی پیشکش اپنے اپنے نظریات کے تحت منفرد انداز میں کی ہے۔ نذر سجاد حیدر کا شمار ان مصنفین میں ہوتا ہے جنھوں نے ناول نگاری کے دورِ اولیں میں لکھنا شروع کیا۔ اس دور میں ناول نگاری کی صنف اپنے ارتقائی مراحل میں تھی اور موضوعات بھی محدود تھے۔ وہ دور عورت کی تعلیم و ترقی کے لیے ہموار نہیں تھا اسی لیے نذر سجاد حیدر نے خواتین کو شعور و آگہی دلانے کی کوشش کی اور اپنی تحریروں کے ذریعے یہ نظریہ پیش کرنے کی کوشش کی کہ تعلیم ہر شخص کا بنیادی حق ہے خواہ وہ مرد ہو یا عورت، دونوں معاشرے کے فعال رکن ہیں۔ نذر سجاد حیدر نے معاشرے کو جنسی تفریق سے ہٹ کر سوچنے کی ترغیب دی اور مرد و زن کو معاشرے میں برابری کا درجہ دیا۔ مصنفہ نے اپنے نظریات کی پیشکش کے لیے عورتوں کی تعلیم و ترقی کے حوالے سے درپیش مسائل کی عکاسی کی ہے۔ اختر النسا بیگم میں مرکزی کردار بظاہر تو پڑھا لکھا ہے لیکن اپنی سوتیلی ماں کی کم علمی اور کی وجہ سے اسے زندگی کا سفر کٹھن معلوم ہوا۔ نذر سجاد حیدر نے معاشرتی رویوں پر سخت تنقید کی ہے جو انسان کو مرد یا عورت میں تفریق کر کے ان سے جینے کا بنیادی حق چھین لیتا ہے۔ اختر النسا بیگم کی تخلیق سے پہلے بہت سے مصنفین نے اپنی تحریروں کے ذریعے معاشرتی اصلاح کی خدمات سرانجام دیں۔ یہ ناول بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے جس میں معاشرتی اصلاح اور خاص کر اصلاح نسواں کی تحریک کو فروغ دیا گیا۔

عصمت چغتائی کا تعلق ناول نگاری کے ترقی یافتہ دور سے تھا۔ ٹیڑھی لکیر کی تصنیف کے وقت اردو ناول اپنی ارتقائی منازل طے کر چکا تھا اور اس کی مکمل صورت سامنے آ چکی تھی اور موضوعاتی اعتبار سے بھی متنوع موضوعات اس

صنف کا حصہ بن چکے تھے۔تاہم یہ عصمت چغتائی کا ہی خاصہ ہے کہ وہ ٹیڑھی لکیر میں کرداروں کی ذہنی ونفسیاتی الجھنوں اور جنسی مسائل کو جس کامیابی سے احاطہ تحریر میں لائی ہیں وہ ان سے قبل مرد مصنفین کے ہاں بھی نہیں ملتا۔عصمت چغتائی نے نا صرف اس دور کے ہندوستانی معاشرے کی تصویر کشی کی ہے بل کہ اپنے مشاہدے اور کمال فن سے وہ کرداروں کے نفسیاتی تجزیے کرنے اور جانچنے میں بھی کامیاب ہوئی ہیں۔انھوں نے معاشرتی مسائل کے پیش نظر فرد کے ذہن پر اثر انداز ہونے والے عوامل کو تلاش کرنے کی کوشش کی ہے۔ان سے پہلے خارجی معاملات وموضوعات پر لکھا گیا تھا انھوں نے فرد کی داخلی دنیا اور کیفیات کو اپنا موضوع بنایا۔دونوں ناولوں کا تقابلی جائزہ ذیل کی سطور میں کیا گیا ہے۔

ا۔ تصورعورت:

دونوں ناولوں کا مرکزی کردار عورت ہے۔اور دونوں ناول عورت کی زندگی کا احاطہ کیے ہوئے ہیں۔اختر النسا بیگم میں اختر کے حالات وواقعات کا بیان ہے اور ٹیڑھی لکیر میں شمن کی ذاتی زندگی اور اس کی ذہنی ونفسیاتی کیفیات کا بیان ہے۔تصورعورت کے حوالے سے بات کی جائے تو دونوں مصنفین نے منفرد کرداروں کی پیشکش کی ہے جو اپنے ارتقائی مراحل میں ہیں۔بیسویں صدی کی پہلی دہائی میں جب عورت کا لکھنا اور پڑھنا تک معیوب سمجھا جاتا تھا۔ایسے میں اختر النسا کا اپنے گھر سے دور رہ کر تعلیم حاصل کرنا اور اعلیٰ تعلیم کے حصول سے اپنے حالات کو بہتر بنانے کی کوشش کرنا ایک انتہائی قدم تھا۔اگر چہ نذر سجاد نے اختر کو ایک کمزور بے بس کردار کی صورت میں دکھایا ہے لیکن کہیں نہ کہیں انھوں نے تعلیمی قابلیت اور اس کی اہمیت کو بھی اجاگر کیا ہے۔اختر کی سوتیلی والدہ کا کردار ایک زبردست منفی کردار کے طور پر ابھر کر سامنے آیا ہے جس کے فیصلوں کے آگے مرد بھی جھکنے پر مجبور ہیں۔وہ اپنے تمام فیصلے ہوشیاری اور سمجھداری کے ساتھ کرنے کی قدرت رکھتی ہے۔اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اس دور میں بھی ایسی خواتین موجود تھیں جو اپنی صلاحیتوں اور خوبیوں کو منوانا جانتی تھیں۔مرکزی کردار کے حوالے سے بات کی جائے تو اختر کو بظاہر کمزور دکھایا گیا ہے لیکن یہاں چونکہ مقصود پڑھی لکھی اور ان پڑھ عورت میں تمیز کروانا تھا اسی لیے اختر کو اپنی والدہ کی سختیوں اور رکاوٹوں کا سامنا بھی کرنا پڑا۔وہ دور چونکہ تعلیم نسواں کے لیے سازگار نہ تھا اسی لیے نذر سجاد نے معاشرتی صورتحال کو مدنظر رکھتے ہوئے ایسی عورت کی تصویر کشی کی ہے جو اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے باوجود اپنی روایات سے جڑی ہوئی ہے تاکہ آئندہ آنے والی خواتین کے لیے یہ در بند نہ ہو جائیں لیکن آخر میں اختر النسا کو ایک کامیاب عورت کے روپ میں دکھایا گیا ہے جس سے تعلیم یافتہ عورت کی خود مختاری اور تعلیم کی اہمیت کی وضاحت ہوتی ہے۔نذر سجاد حدر نے عورت کی خود مختاری کو بطور خاص موضوع بنایا ہے۔وہ عورت کو خود مختار اور با اختیار دیکھنا چاہتی ہیں لیکن معاشرتی حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے انھوں نے اپنے نظریے کی پیشکش کی ہے۔اختر النسا بیگم کے حوالے سے قرۃ العین حیدر یوں رقم طراز ہیں:

"امی نے چودہ برس کی عمر میں ایک نہایت ترقی پسند ناول لکھا۔جس کی ہیروئین اختر النسا بیگم نے مردوں کے معاشرے سے مظالم کا نہایت بے جگری سے مقابلہ کیا اور آخر میں فتح مند ہوئی۔[۱]

یہاں قرۃ العین حیدر کی اس رائے سے اختلاف کیا جا سکتا ہے کیوں کہ اختر النسا فتح مند تو ہوئی لیکن وہ معاشرے کے مردوں کے ہاتھوں استحصال کا نشانہ نہیں بنیں بل کہ اس کی اپنی سوتیلی ماں نے اسے مشکلات سے دوچار کیا۔نذر سجاد حیدر نے محض مرد کو مجرم نہیں ٹھہرایا بل کہ انھوں نے اس پہلو کو اجاگر کرنے کی کوشش بھی کی ہے کہ مرد خود عورت کے ہاتھوں مشکلات کا شکار ہے۔یہاں انھوں نے استحصال کی ذمہ داری محض مرد پر نہیں ڈالی بل کہ پورا معاشرہ اس کا ذمہ دار ہے جو انسان سے اس کے جینے کا بنیادی حق بھی چھین لیتا ہے۔

دوسری طرف عصمت چغتائی کے ناول ٹیڑھی لکیر کے حوالے سے بات کی جائے تو اس میں ایک ایسی عورت کی تصویر کشی کی گئی ہے جو حالات و واقعات کے آگے ہارنے والی نہیں ہے اس میں اتنی طاقت اور ہمت موجود ہے کہ وہ مخالفت کا سامنا کرتے ہوئے اپنے موقف پر ڈٹی رہے۔ناول کا مرکزی کردار شمن ہے جو روایتی عورت کے تصور سے یکسر مختلف نظر آتی ہے اور زندگی گزارنے کا اپنا ایک نصب العین رکھتی ہے۔شمن کی پیدائش ایک ایسے گھر میں ہوئی جہاں پہلے ہی بہت سے بچے موجود تھے اسی لیے وہ عدم توجہی کا شکار بھی رہی۔جس سے اس کی شخصیت میں منفی رویے پروان چڑھنے لگے،لیکن وہ ایک مضبوط کردار کے طور پر پیش کی گئی ہے۔

شمن کی ماں کے حوالے سے بات کی جائے تو وہ اسی روایتی عورت کی تصویر ہے جس کا مقصد حیات خاندان کی بڑھوتری ہے اور اس کے پاس اولاد کی تربیت تک کے لیے وقت نہیں۔شمن کی ماں پدرسری معاشرے کی ایک مجبور عورت کے طور پیش کی گ ء ہے جسے بچے پیدا کرنے کی مشین سمجھا گیا اس کے علاوہ اس کا کوئی اور مصرف نہیں جانا گیا۔لیکن شمن اس سے یکسر مختلف کردار کی صورت میں ابھرتی ہے جو اپنی اذدواجی زندگی کو کسی بھی سمجھوتے کے تحت گزارنا اپنی تحقیر سمجھتی ہے۔شمن کا کردار اس ہندوستانی معاشرے سے منحرف اور باغی کردار ہے جو نسائیت کے نام پر لگائی جانے والی پابندیوں سے خود کو آزاد تصور کرتی ہے۔شمن ان تمام معاشرتی رویوں سے منحرف ہے جو عورت کی آزادی اظہار پر لگائی جانے والی پابندیوں کو قابل تحسین سمجھتے ہیں۔اسے اپنی ذات میں موجود خوبیوں اور صلاحیتوں کا پوری طرح سے ادراک ہے اس لیے وہ کسی بھی قسم کی جکڑ بندیوں کو خاطر میں لائے بغیر اپنی زندگی کے فیصلے خود کرتی ہے۔

ٹیڑھی لکیر کا ایک اور اہم نسائی کردار ایلما ہے جو ہندوستانی معاشرے کے نام نہاد اصولوں سے باغیانہ رویہ اختیار کرتی ہے۔ہندوستانی معاشرے میں جہاں لڑکی کا اپنی مرضی سے شریک حیات کا انتخاب کرنا بھی معیوب سمجھا جاتا تھا۔وہاں اس نے بنا شادی کے ایک بچے کو جنم دے کر ہندوستانی معاشرے کی فرسودہ بنیادوں کو متزلزل کر دینے کی ہمت

کی۔اور بعد میں روایتی ماں کے کردار سے بھی انحراف کیا۔اس کے نزدیک سماج بذات خود کوئی اہمیت نہیں رکھتا بل کہ اصل اہمیت ذات کی ہے۔عصمت چغتائی نے سماجی رویوں پر طنز بھی کیا ہے اور روایتی تصور عورت کی عکاسی ان الفاظ میں کی ہے:

"عورت! کیا یہی تھی عورت جو حلوے کی مرغن قاب کی طرح سجا بنا کر کل ایک نئے مہمان کے سپرد کی جانے والی تھی۔۔۔یہ وقتی وارنش دو چار گھسوں میں اتر جائے گی اور دلہن صرف بیوی بن کر رہ جائے گی! لفظ بیوی کے خیال ہی سے شمن کے جسم میں کپکپی دوڑ گئی۔نوری کے نوجوان جسم سے لپٹے ہوئے درجنوں بچے، اور ہزاروں فکریں جونکوں کی طرح چپکی خون چوستی نظر آنے لگیں"[۲]

دونوں ناولوں کے مرکزی نسائی کرداروں کا تقابل کیا جائے تو ایک واضح ارتقائی شکل سامنے آتی ہے۔ایک طرف اختر النسا بیگم ہے جو باشعور ہونے کے باوجود معاشرتی دباؤ، رکھ رکھاؤ اور لحاظ کی وجہ سے اپنے لیے کسی قسم کا فیصلہ نہ کر پائی اور ظلم سہتی پیکر وفا و شعار بنی رہی لیکن جب ظلم اپنی انتہا کو پہنچ گیا تو اس نے اپنے لیے انتہائی قدم اٹھایا۔تو دوسری طرف شمن ہے جو زندگی میں ظلم سہنا تو درکنار اس کسی چھوٹی سی بات پر بھی اپنی ذات کو تکلیف دینا پسند نہیں کرتی۔بل کہ حالات سے ٹکر لینے کی صلاحیت بھی رکھتی ہے۔

اختر النسا بیگم کے ان پڑھ خاندان میں بیاہے جانے اور ایلما اور شمن کے شادی کے حوالے سے تصورات کا تقابل کیا جائے تو ٹیڑھی لکیر کے کردار زیادہ فعال نظر آتے ہیں۔جہاں عورت کی اپنی ذات اور اس کی محسوسات کو زیادہ اہمیت حاصل ہے۔اختر النسا کی شادی ایک ایسے گھر میں کی گئی تھی جہاں اس کا واسطہ اخلاقی طور پر گرے ہوئے جاہل خاندان سے پڑا اور انھوں نے اس کے لیے مسائل کھڑے کیے لیکن اس کے باوجود وہ ہندوستانی شرم و لحاظ کی پتلی بنی روایتی عورت کی طرح مجبور اور بے بس کردار کے طور پر سب سہتی رہی۔

اختر النسا اپنی زندگی کی مشکلات پر اپنے علم و عمل کی بنیاد پر قابو پا لیتی ہے۔لیکن ٹیڑھی لکیر میں صورتحال یکسر مختلف ہے، اس ناول میں عورت خود مختار ہے وہ اپنی زندگی کے فیصلے خود کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔اور اگر کسی قسم کے مسئلے سے دوچار ہو بھی جائے تو حالات کو سلجھانے کی کوشش کرتی ہے۔شمن کے کردار کے حوالے سے بات کی جائے تو وہ ایک خود مختار لڑکی ہے جو شادی کے معاملے میں ہندوستانی روایات سے منحرف ہے اس نے نا صرف اپنی پسند سے شادی کی بل کہ غیر مذہب، غیر ملک کے شخص سے شادی کی اور بعد میں جب اس کے ساتھ بھی نباہ نہ کر پائی تو بندھن ختم کر دیا۔دونوں ناولوں میں ایسے نسائی کردار موجود ہیں جو کہیں نہ کہیں خود مختار ہیں لیکن ٹیڑھی لکیر کے کردار اختر النسا بیگم سے زیادہ فعال ہیں اور اپنا ایک واضح نصب العین اور طاقت رکھتے ہیں۔

۲۔ سماجی حیثیت:

شخصیت کی تعمیر اور تشکیل میں معاشرہ اہم کردار ادا کرتا ہے۔ کسی بھی شخص کے حالات و واقعات اس کی شخصیت پر نمایاں طور پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ کسی بھی کردار کو سمجھنے کے لیے اس کے حالات و واقعات اور سماجی حیثیت کا معلوم ہونا بڑا ضروری ہوتا ہے۔ اسی سے اس کی انفرادیت کو پرکھنے میں مدد ملتی ہے۔ اختر النسا بیگما ور ٹیڑھی لکیر کی تصنیف دو الگ ادوار میں الگ سماجی و معاشرتی صورت حال میں ہوئی۔ اسی لیے دونوں ناولوں کے کردار مختلف عمل اور ردعمل ظاہر کرتے ہیں اور الگ نظریہ حیات لیے ہوئے ہیں۔ اختر النسا بیگم کی تصنیف کے دور کا تعین کیا جائے تو ایک ایسے معاشرے کا تصور ذہن میں ابھرتا ہے جو تعلیم نسواں کے حوالے سے اپنی تمام تر پابندیوں اور رکاوٹوں سے عبارت ہے۔ جہاں لڑکی کو اونچی آواز میں بولنے کی اجازت نہیں تھی اور اس کا گھر سے نکلنا بھی معیوب سمجھا جاتا تھا۔ اس صورت میں نذر سجاد حیدر نے تعلیم نسواں کی اہمیت و ضرورت کے تحت یہ نظریہ پیش کرنے کی کوشش کی ہے کہ تعلیم یافتہ فرد ہی معاشرتی ترقی کا ضامن ہو سکتا ہے اور معاشرہ تب تک ترقی کی راہ پر گامزن نہیں ہو سکتا جب تک ہم اس کے اہم ستون یعنی عورت کو اتنا اختیار نہیں دیں گے کہ وہ معاشرتی ترقی کا بوجھ اٹھا سکے۔ عورت کی سماجی حیثیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ عورت کے بغیر معاشرہ ترقی نہیں کر سکتا لیکن اس دور کے ہندوستان میں اسے یہ حق حاصل نہیں تھا۔ نذر سجاد نے اپنی تحریروں میں عورت کی سماجی حیثیت کو بلند کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس کی مثال یوں ملتی ہے:

> "اگر بہتری قوم منظور ہے۔ تو سب سے پہلے جہاں تک ممکن ہو سکے۔ تعلیم نسواں عام کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ اس کا انتظام کر لیا تو سمجھنا چاہیے کہ ساری قوم سنبھل گئی۔ کیونکہ بے علم معراج ترقی پر پہنچنا ناممکن ہے۔ خواہ آپ کتنا ہی علم حاصل کر لیں۔ کبھی آگے نہ بڑھ سکیں گے۔ جب تک کہ دنیا میں اپنی سب سے پہلی رہنما عورتوں کو جن کی گود تمام قوم کا ابتدائی سکول ہے۔ چشمہ علم سے سیراب نہ کر سکیں گے۔۔۔" [۳]

اس دور کے ہندوستانی معاشرے میں عورت کی سماجی حیثیت اچھی نا تھی۔ اسے ضروریات زندگی تک سے محروم رکھا جاتا تھا۔ ایسے فیصلے جو اس کی پوری زندگی پر اثر انداز ہوتے، ان میں بھی اسے آزادی اظہار کی اجازت نہ تھی اسے ایک آبجیکٹ کی طرح برتا جاتا تھا۔ اس کی ایک مثال لڑکی کی بنا مرضی کے شادی کر دینا ہے۔ یا پھر صغر سنی کی منگنی اور شادی کا طے کر دینا جب بچے کو خود بھی اپنے اچھے برے، اپنی پسند ناپسند کا شعور نہیں ہوتا۔ اختر النسا بیگم کے ساتھ بھی ایسا ہی معاملہ پیش آیا، اس کی شادی اس کی رضامندی کے بنا اس کی سوتیلی ماں کی مرضی سے ایک ایسے شخص کے ساتھ طے پائی جس سے اس کی کوئی ذہنی ہم آہنگی نہ تھی بل کہ وہ اس کے معیار کا جوڑ بھی نہیں تھا۔ اختر ایک پڑھی لکھی سمجھدار اور فہم و فراست والی لڑکی تھی جب اس کے برعکس اس کا شوہر ان پڑھ شخص تھا لیکن یہاں مصنفہ کا مقصود چونکہ تعلیم کی اہمیت کو

ابھارنا تھا اس لیے نذر سجاد نے اختر کو اپنی تعلیمی قابلیت کی بنیاد پر حالات پر قابو پاتے دکھایا ہے۔

اختر النسا بیگم میں اختر کو سماجی طور پر کمزور کردار کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ اختر نے اپنی زندگی کو اپنے شوہر اور حالات کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا اور اپنے لیے بھی کسی قسم کا کوئی فیصلہ لینے کا اختیار اپنے پاس نہ رکھا اس کی مثال ناول میں یوں ملتی ہے:

> "آہ پیاری نجم کو کیا لکھوں؟ بس کچھ نہیں لکھا جاتا۔ اور نہ آئندہ لکھا جا سکے گا۔ کیونکہ اب میں اپنے شوہر کی بے اجازت کوئی کام نہ کروں گی۔ گو انھوں نے مجھے اب تک کچھ نہیں کہا۔ لیکن آپ سب سے خط و کتابت کرنے کی میں ان سے اجازت نہ مانگوں گی۔ کیونکہ جس طرح میری زندگی نے پلٹا کھایا ہے اسی طرح میں بھی اس کے مطابق بسر اوقات کروں گی" [۴]

ناول میں بعض نسائی کردار طاقتور بھی دکھائے گئے ہیں جو اپنی مرضی سے اپنی فیصلے لینے میں خود مختار ہیں اور انھوں نے مردوں کی زندگی بھی اجیرن کر رکھی ہے لیکن انھیں قدیم روایات کی پاسداری کرتے ایسے کرداروں کے طور پر ابھارا گیا ہے جو اخلاقی گراوٹ کا شکار ہیں اور ان کے لیے اپنی ذات سے بڑھ کر کوئی شے بھی اہم نہیں ہے۔

دوسری طرف ٹیڑھی لکیر کے نسائی کرادروں کا مطالعہ کیا جائے تو اس کے کردار ایسے فعال کرداروں کی صورت میں ابھر کر سامنے آتے ہیں جو مصائب کے باوجود اپنی ذات کو کسی بھی طرح مدغم نہیں ہونے دیتے۔ شمن اس ناول کا زندگی سے بھرپور کردار ہے جو اپنی حیثیت کو منواتی ہے اور اپنے ہونے کا احساس دلاتی ہے۔ وہ معاشرتی جبر کو قبول نہیں کرتی ہے بل کہ اس سے ٹکر لے کر اپنی ذات کا یقین دلاتی ہے۔ عصمت چغتائی کے ہاں عورت کی سماجی حیثیت نسبتاً بہتر نظر آتی ہے۔ اس کی ایک وجہ معاشرتی تبدیلیاں بھی ہیں۔ نذر سجاد کے ناول سے تقابل کیا جائے تو اس دور میں معاشرہ ہی اس بات کو قبول نہیں کرتا تھا کہ عورت پڑھنے لکھنے کے لیے گھر سے باہر آئے اور اپنے حقوق سے واقف ہو، لیکن عصمت چغتائی کے دور تک پہنچتے پہنچتے حالات کافی حد تک بدل چکے تھے اور عورت پر مسلط پردہ اور دیگر معاشرتی پابندیاں کسی حد تک کمزور پڑ چکی تھیں۔ اس صورت میں عورت سماجی طور پر بھی مضبوط ہو گئی تھی اور اپنے برے بھلے سے واقف تھی۔ عصمت چغتائی کے ہاں معاشرتی اقدار کی رد تشکیل نظر آتی ہے۔ انھوں نے سماج اور سماجی رویوں پر تنقید کی ہے اور غیر ضروری بندشوں کو توڑنے کی ترغیب دی ہے اس کی مثال ان کے اس جملے میں ملتی ہے: "جب ہم نے ہی سماج بنایا ہے تو ہم ہی توڑ بھی سکتے ہیں" [۵]

عصمت چغتائی کے نسائی کردار سماجی بندشوں میں الجھنے کی بجائے ان بندشوں کو توڑتے دکھائی دیتے ہیں۔ شمن کا

کردار اس کی اہم مثال ہے۔ محض شمن ہی نہیں بل کہ دوسرے کردار بھی ان جکڑ بندیوں سے آزاد ہونے کے لیے تیار ہیں اور روایتی طریق زندگی سے کسی حد تک اکتائے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ٹیڑھی لکیر کے کردار جدت پسند ہیں اور فرسودہ روایات کو اپنی راہ کی رکاوٹ نہیں بننے دیتے ۔اس کی ایک مثال ایلما کا کردار بھی ہے۔ایلما روایات سے منحرف ہے اور وہ اس میں مذہب تک سے بیگانہ ہے۔ وہ انسان کو تمام تر حدود و قیود سے آزاد ایک جاندار تخلیق سمجھتی ہے اور کوشش بھی یہی کرتی ہے کہ اس کی آزاد دنیا میں کوئی ایسی رکاوٹ نہ آنے پائے۔ایلما کے کردار کی وضاحت کے ساتھ معاشرے کی عکاسی شبنم رضوی نے ان الفاظ میں کی ہے:

> "عام طور پر بن بیاہی ماں بننے کا جب خطرہ ہوتا ہے تو لڑکی سماج اور کاندان کے ڈر سے لڑکے سے شادی کرنیکی خواہش کرتی ہے مگر یہاں سیتل بار بار شادی پر زور دے رہا ہے اور ایلما اسے نیچا دکھانے کے لیے اس کے بچے کو گرانے کو تیار ہے۔ یہ کردار نئی اور پرانی روایت کے بیچ کش مکش میں مبتلا دکھائی پڑتا ہے۔ایک جگہ تو وہ بغیر شادی کے افتخار کے بچے کی ماں بننے کی خواہش مند ہے اور جب یہ خواہش غیر شعوری طور سے سیتل سے پوری ہو جاتی ہے تو وہ محسوس کرتی ہے کہ "جسمانی طور پر تو میں واقعی بہت دن زندہ رہوں گی مگر میری روح مر چکی ہے"[۶]

یہاں عصمت چغتائی نے ایلما کو سماجی طور پر ایک مضبوط کردار کے طور پر پیش کیا ہے جو معاشرے میں برابری کی طلبگار ہے اور اپنی اہمیت جانتی ہے۔ان کے ہاں سماجی طور پر مضبوط نسائی کردار دکھائے گئے ہیں۔

۳۔ فیصلے کا اختیار:

اختر النسا بیگم میں اختر ایک ایسے کردار کے طور پر سامنے آئی ہے جو ابتدا میں اپنا کوئی نظریہ زندگی نہیں رکھتی۔اور خود کو حالات کے رحم و کرم پر چھوڑ دیتی ہے۔اختر نے حالات سے مفاہمت کا راستہ اختیار کیا اور باوجود اس کے کہ وہ ایک پڑھی لکھی باشعور لڑکی ہے، اس نے اپنے لیے کسی بھی قسم کا فیصلہ لینے سے گریز کیا۔اختر کی سوتیلی ماں نے جب اس کے لیے ان پڑھ لڑکے سے شادی کا جال بچھایا تو اس نے نا چاہتے ہوئے بھی فیصلہ اپنے بڑوں پر چھوڑ دیا بالکل اسی طرح جس طرح اس دور کی عام لڑکیاں اپنی زندگی کا اختیار دوسروں کو دے دیا کرتی تھیں۔شادی کے بعد اس کی زبوں حالی جب اپنی انتہا کو پہنچی اور شوہر اور خاندان کے دیگر افراد کی وفات کے بعد جب اسے کوئی اور راستہ سجھائی نہ دیا تو اس نے اپنی ذات کے بارے میں سوچا اور اپنی حالت کو بہتر بنانے کی کوشش کی۔ اور اپنی تعلیم کے بل بوتے پر اپنی زندگی گزارنے کے لیے نوکری اختیار کی۔

ناول میں اختر النسا کا کردار ایک ایسی عورت کی تصویر کشی کرتا ہے جسے اپنے حقوق کا ادراک ہے لیکن اس کے پاس قوت فیصلہ اور اتنا اختیار نہیں ہے کہ وہ اپنی خواہش اور پسند و ناپسند کو عملی جامہ پہنا سکے۔ ایسا بھی نہ تھا کہ اختر کو کوئی ایسا شخص میسر نہ تھا جو اس کی بنا پسند کی شادی کے خلاف کوئی قدم اٹھا سکے اور اسے اس مصیبت میں پھنسنے سے بچا سکے۔ لیکن اس نے شادی سے انکار کے موضوع پر کسی سے بات کرنا بھی گوارا نہ کیا اور جو اسے کچھ کہتا وہ اسے خاموش کروا دیا کرتی۔ اس کی مثال یوں ملتی ہے:

"۔۔۔مس صاحبہ کو اس سے بہت ہمدردی تھی۔ اختر کی شادی ان کو بالکل ناپسند تھی۔ اور بہت سمجھاتی تھیں کہ "تم انکار کر دو"۔ مگر اختر ہندوستانی شرم کی پتلی تھی۔ وہ ان کی اس قسم کی باتیں سن بھی نہ سکتی تھی۔ اور کہہ دیتی تھی کہ "آپ اس باب میں کچھ نہ کہیں جو میرے والدین کو منظور ہے وہ ہوگا"[۷]

اختر النسا نے خود کو وقت کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا اور ہندوستانی معاشرے کے کٹر نسطریات سے منحرف ہو کر اپنے والدین سے یہ پوچھنے تک کی جرات نہ کی کہ وہ کن لوگوں کے حوالے کی جا رہی ہے۔ لفظ "حوالے" پر غور کیا جائے تو واقعی اس دور کے ہندوستانی معاشرے میں لڑکی کی شادی محض سودے بازی بن کر رہ گئی تھی۔ جہاں اسے اس کی مرضی پوچھے بغیر ایک مالک سے دوسرے مالک کے سپرد کر دیا جاتا تھا۔ ایسے ماحول میں لڑکی کو یہ اختیار بالکل نہیں دیا جاتا تھا کہ وہ اس معاملے پر اپنی کسی بھی قسم کی رائے کا اظہار کرے۔ اختر النسا بیگم کا کردار اس دور کی ہندوستانی عورت کی تصویر کشی کرتا ہے جو علم و فہم اور شعور ذات کے باوجود اپنے لیے کسی بھی قسم کا فیصلہ لینے کی اہل نہیں۔ اور افسوس کے سوا اس کے پاس کوئی اور چارہ بھی نہیں۔ اس کی ایک مثال ان سطور میں ملتی ہے:

"۔۔۔افسوس مجھے اتنا بھی نہیں معلوم۔ کہ میں آج سے جن لوگوں کے سپرد کی گئی ہوں۔ وہ لوگ کون ہیں۔ کہاں کے ہیں؟ جس کے ساتھ میری زندگی بسر ہوگی۔ اس کی عادت، مزاج، اخلاق، تعلیم، عمر، خیالات، نام تک بھی تو مجھے معلوم نہیں۔ مجھے بیگم پر کچھ افسوس نہیں وہ سوتیلی ماں ہے۔ میرے ساتھ جو بھی کرے بجا ہے۔ ہائے افسوس تو پیارے ابا جان پر ہے۔ انھوں نے مجھ پر ذرا رحم نہ کیا۔ اور غیروں کی خوشی پر مجھے قربان کر دیا"[۸]

ٹیڑھی لکیر میں عورت کی سماجی حیثیت نسبتاً بہتر دکھائی گئی ہے۔ عصمت چغتائی کے نسائی کردار مضبوط اور فیصلے کا اختیار رکھتے ہیں اور سماجی طور پر مضبوط ہیں۔ ان میں شمن کا کردار سرفہرست ہے جو سماجی اقدار کو تحس نحس کر دینے کا جذبہ رکھتی ہے اور اپنے لیے اپنی من مانی ڈگر اختیار کرتی ہے۔ شمن قدیم ہندوستانی عورت سے قدرے مختلف ایک متحرک اور مضبوط کردار ہے۔ قدیم ہندوستانی معاشرے میں لڑکے تک کو اپنی شادی کے حوالے سے پسند کا اظہار کرنے کی اجازت

نہیں تھی لیکن عصمت چغتائی کے ہاں شمن کی صورت میں ایک باغی عورت کے طور پر ابھرتی ہے، جو نا صرف پسند کی شادی کرتی ہے بل کہ ذات پات، رنگ و نسل سے بالاتر ہو کر آئرش نوجوان سے شادی کر لیتی ہے ایسا کرنے سے وہ گویا پورے سماجی ڈھانچے کو متزلزل کر کے رکھ دیتی ہے۔ جو صدیوں سے اپنے اندر پیدا ہونے والی کسی بھی تبدیلی کو قبول کرنے سے گریزاں تھا۔ اور پھر سماجی دباؤ کے باوجود اس شادی کو کامیاب بنانے کی کوشش میں زندگی برباد نہیں کرتی۔ تاہم یہاں بھی اسے مایوسی کا سامنا کرنا پڑتا ہے کیونکہ وہ جس نکتہ نظر کے ساتھ جینا چاہتی ہے۔ وہ اس کے شوہر کے لیے قابل قبول نہیں ہوتا۔ چنانچہ نتیجہ دائمی جدائی کی صورت میں ابھرتا ہے۔

اسی طرح ایک کردار ایلما کا بھی پیش کیا گیا ہے جو بنا شادی کے ماں بننے کے باوجود اس شخص سے رشتہ ازدواج میں محض اس لیے بندھنا نہیں چاہتی کہ لوگ کیا کہیں گے؟ اسے اس کی کوئی پروا نہیں ہے کہ لوگ اس کے بارے میں کیا کہیں گے بل وہ اپنی مرضی کے مطابق اکیلی بچے کو جنم دے کر اسے اپنا لیتی ہے۔ وہ روایتی ماؤں کی طرح اس ناجائز اولاد کو قبول کرنے سے بھی قاصر ہے جس نے اس کی جسم کی بھوک کو مٹا کر روح کی پیاس بڑھا دی۔ یہاں اس تصور سے بھی انحراف کیا گیا ہے کہ بچے عورت کے پاؤں کی زنجیر بن جاتے ہیں۔ ایلما نے اپنے بچے کو اپنے پاؤں کی زنجیر تو نہ بننے دیا لیکن اسے ساتھ ساتھ لیے ضرور پھری۔ جس سے اس کے ممتا کے جذبے کی تسکین محسوس ہوتی ہے۔

۴۔ معاشرے کی عکاسی:

موضوع کے حوالے سے دیکھا جائے تو دونوں ناول ہندوستانی معاشرے کی صورتحال بیان کرتے ہیں بنیادی موضوع ہندوستانی معاشرہ ہی ہے۔ ثانوی طور پر دیکھا جائے تو اپنے عہد اور حالات کے حوالے سے کہیں نہ کہیں کوئی تفریق پائی جاتی ہے۔ اختر النسا بیگم ایک محدود حد تک ہندوستانی خواتین کی تصویر کشی کرتا نظر آتا ہے۔ اختر النسا بیگم کی اشاعت ۱۹۱۰ میں ہوئی اور ٹیڑھی لکیر ۱۹۴۴ میں منظر عام پر آیا۔ دونوں ناولوں کی تصنیف میں تین دہائیوں کا وقفہ پایا جاتا ہے۔ اختر النسا بیگم کی تصنیف کے دور میں ناول اپنی ارتقائی منازل طے کر رہا تھا اور عصمت چغتائی کے دور میں پہنچنے تک ترقی یافتہ دور میں داخل ہو چکا تھا۔ اس حوالے سے معاشرتی معاملات و مسائل بھی مختلف نوعیت کے ہو گئے تھے۔ پہلے دور میں عورت کے لیے حصول تعلیم ناممکنات میں سے تھا۔ جب کہ بعد ازاں فروغ تعلیم نسواں کی تحریکوں سے خواتین کے لیے بھی تعلیم و ترقی کی راہیں ہموار ہو چکی تھیں تو ادب میں عورت کی تصویر کشی بھی مختلف انداز میں کی گئی۔ اختر النسا بیگم میں ہندوستانی معاشرے اور خاص کر عورت کو موضوع بنایا گیا ہے جس میں اس کی تعلیمی ضروریات کو مدنظر رکھتے ہوئے نظریے کی تشکیل کی گئی ہے اس دور میں متعدد مصنفین نے تعلیم نسواں کے حوالے سے تحریریں لکھیں۔ جن کا مقصد خواتین کو تعلیمی زیور سے آراستہ کرنا تھا اس حوالے سے علی عباس حسینی یوں رقم طراز ہیں:

"اس اصلاحی دور میں۔۔۔کچھ پڑھی لکھی عورتوں نے چھوٹے قصے اور ناول بھی لکھے۔ان کا مقصد لڑکیوں کو صحیح تعلیم دینا تھا اور انتظام خانہ داری بتانا تھا۔ان کی غرض حسن وعشق کی کہانی سنانا نہ تھی اور نہ جنسیات،اقتصادیات وسیاسیات کے مسائل سے بحث ان کا مقصد تھا۔۔۔"[۹]

یہی صورت اختر النسا بیگم میں بھی ملتی ہے۔ناول میں نظریہ تعلیم کی حمایت میں پلاٹ کی تشکیل کی گئی ہے اور تمام حالات وواقعات اسی رجحان کی حمایت میں ترتیب دیے گئے ہیں تا کہ ہندوستانی معاشرے میں تعلیمی رجحان اور خاص طور پر تعلیم نسواں کا رجحان پروان چڑھ سکے۔ناول میں اختر النسا کا کردار اسی نظریے کے فروغ کے لیے تمام تر مصائب کا سامنا خاموشی اور تحمل سے کرنے پر مجبور ہے تا کہ علم کی اہمیت واضح ہو سکے کہ وہ کس طرح فرد میں تحمل پیدا کرتی ہے اور اسے معاشرے کا پرسکون فرد بناتی ہے۔

ٹیڑھی لکیر کی تصنیف کے دور تک حالات کافی سازگار تھے اور عورت کو کھل کر اظہار ذات کرنے کی اجازت تھی۔اور ناول میں دیگر فنی اور تکنیکی تبدیلیاں بھی رونما ہوئیں تھیں۔اس لیے عصمت چغتائی نے ایسے کردار پیش کیے جو جدید زندگی کے بعض معاملات میں الجھے ہوئے ہیں،جنھیں بظاہر تو کوئی الجھن نہیں ہے لیکن اندر ہی اندر ایک جہد مسلسل جاری ہے اور نفسیاتی الجھن میں مبتلا ہیں۔ انھوں نے اپنے ناول میں فرد کو بطور خاص موضوع بنایا ہے جس میں اس کی نفسیاتی کشمکش اور اس کے شخصی رویوں کا ذکر کیا ہے۔اس حوالے سے ڈاکٹر حمیرا سعید یوں رقمطراز ہیں:

"عصمت نے ناول میں فرد کو اس کی سماجی نفسیات کے ساتھ پیش کر کے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ کس طرح فرد کی شخصیت اپنے ماحول کے حساب سے بنتی اور بگڑتی ہے"[۱۰]

اسی طرح ایک لڑکی سے عورت تک کے سفر اور اس کی ذہنی الجھنوں اور اسے پیش آنے والے معاملات کو بیان کیا گیا ہے یہاں عصمت چغتائی نے جنسی رویوں اور کیفیات کا اظہار بھی بے باکی کے ساتھ کیا ہے۔انھوں نے لڑکیوں کو درپیش مسائل کا باریکی سے مطالعہ کیا ہے اور ان مسائل کا ان کی نفسیات پر اثرات کا بیان بھی مدلل انداز میں کیا ہے گویا یہاں وہ ماہر نفسیات کی طرح نوجوان لڑکیوں کو درپیش مسائل کا جائزہ لیتی نظر آتی ہیں۔اس حوالے سے حمیرا سعید یوں رقمطراز ہیں:

"ٹیڑھی لکیر ایک ایسے کردار کی کہانی ہے جس کو عصمت نے اس کے بچپن اور جوانی کی نفسیات،جنسی خواہشات اور ذہنی کشمکش کے ساتھ پیش کیا ہے۔ناول کا مرکزی کردار شمشاد بیگم عرف شمن کا ہے جس کی شخصیت اپنے والدین کی بے توجہی سے بگڑتی جاتی ہے اور اس کا کردار ٹیڑھی لکیر ہو جاتا ہے"[۱۱]

یہاں ایک اہم موضوع والدین کی عدم توجہی کا بیان کیا گیا ہے جس میں ایک اشارہ مرد کی بالادستی اور عورت کی کم

مانگی کی طرف بھی کیا گیا ہے۔ ناول میں والدین کی عدم توجہی کی وجہ سے بچوں کی نفسیاتی بیماریوں کا ذکر کیا گیا ہے اور انھیں خاطر خواہ توجہ نہ ملنے پر جو ردعمل ان کی شخصیت کی خرابی کے طور پر ابھرتا ہے اسے خاص طور پر بیان کیا گیا ہے۔ عصمت چغتائی نے جنسی مسائل کی وجہ مناسب تربیت نہ ہونے کو قرار دیا ہے۔

"اور یہ سب ابا کا قصور تھا، کیا مجال جو اماں دودھ پلا جائیں، ادھر بچہ پیدا ہوا، ادھر آگرے سے گولن منگوائی۔ دودھ پلوئے اور بیگم کی پٹی سے پٹی جڑی رہے۔ پھر بھلا بچے کیوں سانس لیتے؟ گھر کیا تھا، جیسے گائے بیلوں کا باڑا، کھانا ہے تو پتیلوں، پینا ہے تو گھڑوں، سونا ہے تو گھر کا کونا کونا زندگی سے لبریز، چھلکنے کو تیار!۔۔۔۔" [۱۲]

دونوں ناولوں کے موضوعات پر بات کی جائے تو دونوں میں افراد کے معاملات و مسائل کو بیان کیا گیا ہے اختر النسا بیگم میں محض خارجی معاملات و مسائل کا بیان ملتا ہے جب کہ ٹیڑھی لکیر خارجی معاملات و مسائل کے انسانی ذہن پر اثرات کو بیان کرتا ہے یعنی اس میں فرد کے خارجی عوامل کے اس کے داخلی احساسات و جذبات پر بات کی گئی ہے۔ اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والی نفسیاتی الجھنیں بھی ناول کا موضوع بنائی گئی ہیں۔ جب کہ اختر النسا بیگم میں محض واقعات کا بیان ملتا ہے۔ اور کرداروں کی خارجی الجھنیں معلوم ہوتی ہیں۔

عصمت چغتائی نے اس دور کے ہندوستانی معاشرے کی تصویر کشی اس خوبی سے کی ہے کہ اس دور کے مروجہ رسوم و رواج اور معاشرتی تنگ نظری کھل کر سامنے آتی ہے۔ اس دور میں عورت کی محکومی اور معاشرتی جبر کا اندازہ بھی ہو جاتا ہے۔ اس ضمن میں بیوہ کے ساتھ روا رکھا جانے والا سلوک اور اس پر زندگی کے تمام دروازے بند کر کے محض بیوگی کی چادر اوڑھ کر زندگی کے دن تمام کرنا، اس سماج کی عکاسی کرتا ہے جو مذہب تک سے منحرف ہے اور مذہبی طور پر عورت کو دیے گئے حقوق سے بھی کوتاہ ہو جاتا ہے۔ اس حوالے سے عصمت یوں رقم طراز ہیں:

"۔۔۔ زندگی کا سہارا ہی کیا تھا سوائے آہوں اور سسکیوں کے، یہ عمر اور رنڈاپا؟۔۔۔ چوڑیاں اور رنگین دوپٹہ نہیں اوڑھتی تو یہ سب لوگوں پر احسان نہیں تھا تو کیا تھا۔ رنڈاپے میں زندگی کے دن گزار کر وہ مرے ہوئے میاں کے ساتھ جیتے جاگتے، ساس سسر اور ماں باپ کا بھی تو سوگ کر رہی تھی، جب کوئی تہوار آتا تو وہ اپنا ناٹک شروع کر دیتی۔ ایک کونے میں منہ لپیٹ کر پڑ جاتی اور بین شروع کر دیتی۔ جلدی سے گھلی ہوئی مہندی پھنکوا دی جاتی۔ چوڑی والی کو ہش ہش کر کے ٹال دیا جاتا۔ سویوں کا زردہ پکنا ملتوی ہو جاتا۔۔۔" [۱۳]

عصمت چغتائی نے معاشرتی اصول و ضوابط پر کڑی تنقید بھی کی ہے۔ اور بیوہ کے ساتھ روا رکھے جانے والے

سلوک اوراس پر زندگی کی رنگینیوں کے در بند کر دینے کے مسئلے کو بطور خاص پیش کیا ہے۔انھوں نے معاشرتی قیود کیساتھ ساتھ فرد کی ذات پر زیادہ توجہ دی ہے اور فرد پر ان حالات کے اثرات کا جائزہ لیتے ہوئے بڑی آپا کا کردار پیش کیا ہے جو ان بے جا پابندیوں کی وجہ سے برائی کی طرف گامزن ہو جاتے ہیں۔اوران کی رغبت ان چیزوں کی طرف ہو جاتی ہے جو اسلام میں منع ہیں۔اس کی وجہ بھی اسلامی تعلیمات پر عمل نہ کرنا بتایا گیا ہے۔

عصمت چغتائی نے سماجی رویوں کی عکاسی کرتے ہوئے رنگ ونسل کے تعصب کی عکاسی بھی کی ہے۔ ہندوستانی عوام ابھی بھی رنگ ونسل کے تعاصب سے باہر نہیں نکل سکی۔اور یہی وجہ ہے کہ انگریز کو گورے رنگ کے فرق کی وجہ سے امتیازی درجہ دیا گیا تھا،یعنی کالا حقیر اور گورا برتر مانا جاتا تھا۔عصمت چغتائی نے فرد کے ظاہر سے زیادہ اس کے باطن اور اس کی شخصیت کو اہمیت دی ہے اور اس کے ان خصائص کو فوقیت دی ہے جن کی بنیاد پر اسے امتیاز دیا جا سکتا ہے۔اس میں محض ظاہری فرق کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔

"اگر ابھی اس کی جگہ کوئی سفید قوم کی لڑکی ہوتی تو سر بازار اپنے سیاہ بھٹ میاں کو چٹاچٹ چومنے کا حق رکھتی تھی۔بل کہ فخریہ کہتی تھی کہ لو دیکھو میرے روپہلی حسن کی طاقتیں،کہاں کہاں کا جانور پھانس کر لاتی ہیں۔اور وہ سیاہ آدمی بھی اس روپہلی بارش سے کھل کر فخریہ کہتا کہ "دیکھو تم ہم کو کالا سمجھتے ہو مگر یاد نہیں کرشن جی بھی تو کالے تھے اور گوپیاں ان کی متوالی تھیں۔۔۔" مگر وہ،حقیر تھی" [۱۴]

درج بالا سطور میں محض رنگ ونسل کا تعصب ہی نہیں ابھرتا بل کہ مرد کی عورت پر بالا دستی کو بھی موضوع بنایا گیا ہے۔اس حوالے سے عصمت چغتائی نے شمن کے ساتھ شادی کے بعد پیش آنے والے مسائل کا احاطہ کیا ہے اور ہندوستانی معاشرے کی تنگ نظری پر تنقید بھی کی ہے کہ وہ کس طرح رسوم ورواج اور تعصّبات میں الجھ کر دوسرے شخص کے لیے زندگی کا حلقہ تنگ کر دیتے ہیں۔اور بے بنیاد مسائل میں الجھ کر اپنے وقت کے زیاں کا باعث بنتے ہیں۔شمن اور ٹیلر کو شادی کے بعد جن مسائل کا سامنا کرنا وہ دونوں اس کے لیے پہلے سے تیار تھے لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ معاملات سنگین ہوتے چلے گئے اور شمن لوگوں کی ناگوار نظروں کا سامنا نہ کر پائی یوں دونوں کی ذاتی زندگی متاثر ہوگئی۔

"اسٹیشن پر ایک دوسرے سے رشتہ داری ظاہر کرنے کی کوئی ضرورت نہ تھی۔اور کمپارٹمنٹ میں بھی اگر کوئی غور سے دیکھتا تو دونوں کو انسانیت سے زیادہ قریب رشتے میں منسلک تصور نہ کرتا۔وہ ایک دوسرے سے بے توجہ اپنی تنہائی ظاہر کرنے میں کوشاں تھے۔کوئی نہ دیکھتا ہوتا جب بھی حساس بنے غصے ہونے کو تیار رہتے۔ آوازوں پر کان لگائے رہتے کہ کہیں ان کے ہی متعلق کانا پھوسی نہیں ہو رہی ہے غیروں کی طرح ڈائنگ کار میں کھانا کھایا۔بل ادا کرتے وقت ٹیلر کے کان سرخ ہو گئے اور شمن نے بیرے کی ناقدانہ نظروں کا بڑی

مشکل سے مقابلہ کیا۔ دو بے جوڑ انسان اپنے جوڑ کے بے تکے پن کو شدت سے محسوس کر رہے تھے۔[۱۵]

دونوں مصنفین نے ایسی عورت کا تصور پیش کیا ہے جو معاشرے کا ایک ایسا فرد ہے جس پر کئی طرح کی پابندیاں عائد ہیں۔ کہیں وہ تعلیمی ضروریات کی تکمیل کے لیے تو کہیں ازدواجی زندگی کی خوشحالی کے لیے معاشرے کے اصولوں سے بغاوت کا راستہ اختیار کرتی ہے۔ دونوں ناولوں کے نسائی کردار اپنی خواہشات کی تکمیل کے لیے معاشرے کی جکڑ بندیوں سے فرار کی راہ اپناتے سہیں۔ کہیں وہ اس کے تمام مظالم کو برداشت کرتے ہوئے صبر سے ان کا مقابلہ کر کے اپنے مقصد کے حصول میں کامیاب ہوتے ہیں تو کہیں وہ ان بے جا پابندیوں کی تاب نہ لاتے ہوئے ان سے بغاوت کا راستہ اختیار کرتے ہیں۔ ناول میں ذیلی کرداروں میں ایسے نسائی کردار بھی ملتے ہیں جو معاشرتی دباؤ میں محض بچے جننے اور بیوگی میں زندگی بسر کرنے پر مجبور ہیں لیکن ان کی ذمہ داری ان کرداروں پر بھی آتی ہے جو اپنی حالت کو بدلنے کی خود سے کوئی کوشش نہیں کرتے۔ اس میں عورت کے لیے ایک تحریک بھی ہے کہ وہ خود اپنے مسائل پر قابو پانے کے لیے سرگرم عمل ہو جائے۔ جیسا کہ اختر کے کردار سے واضح ہوتا ہے۔ جب تک اس نے خود اپنے لیے حالات کو سازگار بنانے کی کوشش نہ کی حالات اس کے موافق نہیں ہوئے اس میں جستجو اور تڑپ کا ہونا بڑا ضروری امر ہے۔

ناولوں میں عورت کی سماجی حیثیت زیادہ مضبوط نہیں دکھائی گئی۔ انھیں کہیں نہ کہیں معاشرتی دباؤ سہنا پڑتا ہے لیکن اپنی حکمت عملی سے وہ اپنا ایک مقام بنانے میں کامیاب ہو جاتی ہیں۔ اختر کو بھی معاشرتی دباؤ کی وجہ سے تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود کٹھن حالات کا سامنا کرنا پڑا۔ یہاں تک کہ بیوگی کے دن بھی تنہا کاٹنے پڑے لیکن اس نے حکمت عملی سے مزید تعلیم کا سلسلہ شروع کیا اور معاشی معاملات میں بھی خود مختار ہو گئی۔ یہی صورت شمن کی ہے وہ یوں تو ابتدا سے ہی باغی کردار کے طور پر سامنے آئی لیکن پھر بھی معاشرے میں اسے وہ خاص مقام نہ مل سکا جس کی حقدار وہ ایک فرد ہونے کی حیثیت سے تھی۔ معاشرے کے معزز افراد نے بھی اسے کبھی ایک عورت سے اوپر کچھ نہ سمجھا۔ ان کے لیے اس کے وجود کی قیمت اس کے شعور سے زیادہ تھی۔ دونوں کردار چونکہ پدرسری معاشرے میں موجود زندگی کے سفر پر گامزن ہیں اسی لیے انھیں پدر سری نظام کی تمام تر رکاوٹوں کا سامنا کرنا پڑا۔

فیصلے کے اختیار کے حوالے سے دونوں کردار مختلف صورتوں میں خود مختار ہیں لیکن اختر زیادہ تر معاشرے کے تابع نظر آتی ہے۔ اس کے لیے اپنی مرضی کے خلاف شادی کرنا بھی ایک مجبوری تھی۔ وہ اپنی زندگی کے اتنے بڑے فیصلے میں بھی خود مختار نہیں تھی۔ لیکن بعد ازاں شوہر کی وفات کے بعد اس نے اپنی زندگی کے تمام فیصلوں کے اختیارات معاشرے کے معزز افراد سے واپس لیے تا کہ اپنی زندگی بہتر بنا سکے۔ جب کہ شمن ایک خود مختار کردار کے طور پر ابھر کر سامنے آئی ہے جو اپنی زندگی کے بڑے سے بڑے فیصلے میں خود مختار ہے۔ اور اس نے زندگی کے ہر مرحلے پر خود اپنے فیصلے لیے۔

دونوں ناولوں میں ہندوستانی معاشرے کی عکاسی کی گئی ہے اور اسی سے متعلق معاملات و مسائل کی عکاسی کی گئی ہے۔اور اس معاشرے میں رہتے ہوئے نسائی کرداروں کا جائزہ لیا گیا ہے۔ناولوں میں مصنفین نے اس دور کیسماجی، معاشرتی اور دیگر مسائل کی عکاسی بھی بخوبی کی ہے۔دونوں ناول اردو ناول کی تاریخ میں اہم باب ہیں۔جس سے اردو ادب میں نسائی کرداروں کی ارتقائی صورت سمجھنے میں معاونت ملتی ہے۔

حوالہ جات

۱ قرۃ العین حیدر، بحوالہ، اردو ناولوں میں نسائی حسیت، از حمیرہ سعید، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۲۰۰۹، ص ٦٦

۲ عصمت چغتائی، ٹیڑھی لکیر، مکتبہ اردو، لاہور، ۲۰۰۱، ص ۲۳۵، ۲۳٦

۳ نذر سجاد حیدر، اختر النسا بیگم، دارلاشاعت پنجاب، لاہور، ۱۹۲۵ئص ۲۴٦

۴ ایضاً، ص ۱۲۸

۵ ٹیڑھی لکیر، ص ۲۴۲

٦ شبنم رضوی، عصمت چغتائی کی ناول نگاری: ٹیڑھی لکیر کی روشنی میں، نیو پبلک پریس، دہلی، ۱۹۹۲، ص ۱۳۴

۷ اختر النسا بیگم، ص ۱۰٦

۸ ایضاً، ص ۱۰۴

۹ علی عباس حسینی، ناول کی تاریخ اور تنقید، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ص ۳۴۲

۱۰ حمیرا سعید، اردو ناولوں میں نسائی حسیت، ص ۱۱۱

۱۱ ایضاً، ص ۱۱۱

۱۲ ٹیڑھی لکیر، ص ۱۰

۱۳ ایضاً، ص ۵۰

۱۴ ایضاً، ص ۴۳۹

۱۵ ایضاً، ص ۴۳۸